© rasailojaraid.com

مولانا محمد حنیف ندوی

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ

پاکستان بن جانے کے بعد اہلِ فکر کی اس جماعت کے سامنے جو اس خطۂ ارضی کی اسلامی اصولوں کے تحت تعمیر نو کرنا چاہتے تھے پہلا اور بنیادی سوال یہ تھا کہ برطانوی دور کے غیر دینی نظام تعلیم نے جو ہمارے نوجوانوں کو اسلامی تہذیب کے عظیم ورثہ سے محروم رکھا ہے اس کی تلافی کیوں کر ہو۔ اسی طرح فلسفہ، سائنس اور ٹکنالوجی کے ارتقا و فروغ نے نئی پود کے دلوں میں جو تشکیک کے زہریلے بیج بوئے ہیں ان کے مداوے کی کیا صورت ہے؟ زیادہ واضح لفظوں میں سوال دراصل یہ درپیش تھا کہ کیا ماضی میں ہم نے دنیائے انسانیت کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیا ہے، ہماری فکری تازہ کاریوں نے علم و معرفت کی حدود میں توسیع کی ہے یا تہذیب و تمدن کی نئی بستیاں بسانے میں ہماری کوششیں بار آور ہوئی ہیں، اور ہم علم و تحقیق کی ثروت بے پایاں میں معتد بہ اضافہ کرنے میں کامیاب رہے ہیں؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو اس بات کا اہتمام ہونا چاہیے کہ یہ سب چیزیں عصر حاضر کے ان نوجوانوں کے مطالعہ میں آئیں جن کو پاکستان کی ترقی و بہبود کے سلسلے میں اہم کردار ادا کرنا ہے تاکہ وہ اعتماد اور فخر کے ساتھ یہ کام کر سکیں۔

یاد رہے کہ وقت کے تقاضوں کا صرف یہ ایک پہلو تھا۔ اہل نظر کے سامنے اصلاح و تعمیر کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ موجودہ تہذیب نے جن معاشی، عمرانی اور اخلاقی نظریوں کو جنم دیا ہے، یا فہم و ادراک کی جن جدید اصطلاحوں اور سانچوں کی تخلیق کی ہے ان کے مطابق اسلام کی تعبیر و تشریح کا کون ایسا جچا تلا انداز اختیار کیا جائے جو ایک طرف تو ہماری روایاتِ دینی کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہو اور اسلام کی روح کے ساتھ کامل مطابقت رکھتا ہو اور دوسری طرف ایسا معقول ہو کہ موجودہ ترقی پذیر معاشرہ کی تیز رفتاریوں کا ساتھ دے سکے۔

یہ تھے دو اہم سوال جن سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ۱۹۵۰ میں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم نے

© rasailojaraid.com

گورنر جنرل غلام محمد کے مشورہ سے ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کی بنیاد رکھی اور ڈاکٹر صاحب ہی اس ادارے کے پہلے اکیڈمک ڈائرکٹر قرار پائے۔ صحیح بات یہ ہے کہ وہی اس منصب کے لیے موزوں بھی تھے۔ ان کی جامع الصفات ذات میں مشرق و مغرب کی بہترین اور لطیف تر روایات کی آمیزش تھی۔ انھوں نے جہاں کانٹ، ہیگل اور برگساں کے نظریات کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور برسوں حیدر آباد میں رہ کر حکمت و دانش کے انمول موتی بکھیرے تھے وہاں ان کی طبع رسا نے حافظ، رومی اور اقبال کے میکدۂ عرفان و مستی سے بھی جی بھر کے استفادہ کیا تھا۔ مسلک، مذہب، فقہ، مذہب اور تصوف پر ان کی عمیق نظر تھی۔ انھیں خوب معلوم تھا کہ علم و ہنر کے نام پر شیشہ گرانِ مغرب نے کن کن فتنوں کو بنا سنوار کر پیش کیا ہے، کن کن شکوک کی پرورش کی ہے اور کس کس انداز سے ہماری تہذیبی اور تمدنی وحدت و استواری کو پارہ پارہ کرنے کی مذموم کوشش کا ارتکاب کیا ہے۔ یہ اس حقیقت سے بھی آگاہ تھے کہ اس صورتِ حال کی اصلاح کے لیے چارہ سازی کے کیا کیا اسلوب درکار ہیں۔

ادارہ کے قیام کے بعد پہلے ہی قدم پر دشوار ترین مرحلہ رفقائے کار اور شریکانِ سفر کے انتخاب کا پیش آیا۔ دشواری کی نوعیت یہ تھی کہ یا تو بالعموم ایسے حضرات ملتے تھے جنھوں نے مغرب کے دانش کدوں میں تربیت پائی تھی اور یا پھر ان حضرات کی طرف نظر اٹھتی تھی جنھوں نے درس نظامیہ کی آغوشِ علم و فن میں تحصیل و طلب کے مرحلے طے کیے تھے۔ انگریزی دان حضرات میں اس علمی و دینی پس منظر کی کمی تھی جو اسلامیات کے بارہ میں مجتہدانہ صلاحیتوں کی تخلیق کرسکے، اور عربی جاننے والے اگرچہ اس پس منظر سے آگاہ تھے تاہم ان میں یہ افسوس ناک خلا پایا جاتا تھا کہ یہ عصرِ حاضر کے تقاضوں سے ناآشنا تھے۔ ان حالات میں ان سے یہ توقع رکھنا بعید از قیاس تھا کہ یہ فکر و نظر کے ان پیمانوں کا خیال رکھ سکیں گے جن کو موجودہ زمانے کے تقاضوں نے پیدا کیا ہے، اور اگر یہ دونوں چیزیں مل بھی گئیں تو محسوس ہوا کہ ایسی جامع شخصیتوں میں اس دھن، اس شوق اور اس عشق کی کمی ہے جس کو کسی نصب العین کو پروان چڑھانے کے لیے شرطِ اوّل کی حیثیت حاصل ہے۔

خلیفہ صاحب کی نگاہ مردم شناس نے اس مشکل کو بھی حل کر ہی لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کے گرد اہلِ کمال کا ایک حلقہ جمع ہونا شروع ہوگیا۔ میں نے ادارہ کی رکنیت ۱۹۵۱ء میں اختیار کی۔ مجھ سے پہلے ڈاکٹر رفیع الدین، مولانا مظہر الدین صدیقی، اور خواجہ عباداللہ صاحب اختر بحیثیت رفیق کے کام کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آغاز کر چکے تھے۔ میرے بعد مولانا شاہ محمد جعفر صاحب پھلواروی اور جناب بشیر احمد صاحب ڈار تشریف لائے۔ مولانا رئیس احمد جعفری ان دنوں کراچی میں تصنیف و ترجمہ کے مشغلہ میں مصروف تھے خلیفہ صاحب ان کو بھی یہاں کھینچ لائے تاکہ بزمِ ثقافت کسی بھی اہلِ قلم کی خدمات سے محروم نہ رہے۔

ظاہر ہے رفقاء کا یہ انتخاب حد درجہ موزوں تھا۔ یہ سب لوگ منجھے ہوئے اور تجربہ کار تھے۔ ڈاکٹر رفیع الدین "آئیڈیالوجی آف دی فیوچر" لکھ کر علمی و دینی حلقوں میں اپنا اثر و رسوخ قائم کر چکے تھے۔ مولانا مظہر الدین انگریزی اور اردو دونوں میں یکسانی و روانی کے ساتھ لکھنے پر قادر تھے اور ادارہ میں شرکت سے پہلے اپنی مصنفانہ صلاحیتوں کا لوہا منوا چکے تھے۔ خواجہ عباد اللہ اختر ایک مخصوص مدرسہ فکر کے حامل تھے اور فارسی ادب میں خاصی دستگاہ رکھتے تھے چنانچہ بیدل پر ان کی کتاب جو ادارہ ہی میں رہ کر انھوں نے ترتیب دی ان کے اعلیٰ ذوقِ شعری پر دلالت کناں ہے۔ مولانا جعفر شاہ صاحب ایک جانے بوجھے باذوق، دقیقہ سنج اور نکتہ طراز عالمِ دین تھے جنھوں نے تعلیم و تربیت کی منزلیں قدیم روایات کے ماحول میں طے کی تھیں مگر قلب و ذہن کی طرفہ طرازی اور اپج کو ہمیشہ انھوں نے محفوظ رکھا۔ اس پورے حلقہ میں بشیر احمد صاحب ڈار کی شخصیت حد درجہ پیاری اور منفرد تھی۔ انھوں نے اپنی علمی زندگی کا آغاز گو معلمی سے کیا مگر خداداد ذہانت اور محنت کی بدولت بہت جلد ان حدود سے آگے نکل گئے جو اس پیشہ کا خاصہ ہیں۔ انھیں دیکھ کر جاحظ کے اس طنز کی تردید ہو جاتی ہے کہ معلم اپنے ذوق اور سطحِ ذہنی کے اعتبار سے ہمیشہ معلم ہی رہتا ہے۔ ادارہ میں آنے سے پہلے ہی یہ علامہ اقبال اور ان کے فلسفے کے بارے میں Iqbal and His Philosophy لکھ کر اہلِ فکر و دانش سے داد حاصل کر چکے تھے:

ادارہ کی تشکیل کے بعد خلیفہ صاحب مرحوم نے رفقاء سے بحث و مشورہ کے بعد کام کا جو نقشہ ترتیب دیا اس کے موٹے موٹے اصول یہ تھے

۱۔ نئی پود کی نظروں میں اپنی علمی و تہذیبی انفرادیت کو اجاگر کرنے کے لیے اسلاف کی ان فقیہانہ اور حکیمانہ کاوشوں پر روشنی ڈالی جائے جن سے یہ معلوم ہو سکے کہ ہم نے ماضی میں حکمت و معرفت اور فقہ و قانون کے گوہر ہائے تاباں کی اشاعت و فروغ میں کیا کوششیں کی ہیں اور علوم و فنون کو کہاں سے کہاں تک اچھال دیا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۲۔ پیش آئندہ اجتماعی و ملّی مسائل میں جو مشکلات پیش آئیں ان پر غور کیا جائے اور ان کو اس توازن و اعتماد کے ساتھ حل کیا جائے کہ جس سے نہ صرف معاشرہ ترقی و تقدم کے بام رفیع تک آسانی سے پہنچ سکے بلکہ یہ حقیقت بھی نکھر کر عصرِ حاضر کے سامنے آ جائے کہ اسلام ہر ہر دور میں قیادت و رہنمائی کی پوری پوری اہلیت رکھتا ہے اور علم و تحقیق کے ہر ہر میدان میں ہمارے لیے مشعلِ راہ ثابت ہو سکتا ہے۔

۳۔ اسلام کی تعبیر اس طرح سائنسی اور علمی انداز میں کی جائے کہ جو مادیت نئے اس طلسم کو پاش پاش کر کے رکھ دے جس کو مغرب کے ساحرانِ علم و ہنر نے گذشتہ تین صدیوں میں ترتیب دیا ہے۔

۴۔ ثقافت کے نام سے ایک ماہوار علمی مجلہ جاری کیا جائے جو ادارہ کے افکار و نظریات کا ترجمان ہو۔

۵۔ وقتاً فوقتاً ایسی علمی مجالس کا انعقاد کیا جائے جس میں کسی خاص علمی موضوع پر مختلف اہلِ علم مقالے پڑھیں، اور زیر بحث نقاط پر تبادلۂ خیالات سے کام لیں۔

۶۔ رفقاء کے لیے ایسی لائبریری کا اہتمام کیا جائے جس سے یہ تصنیف و تالیف کے سلسلہ میں استفادہ کر سکیں۔

نامناسب نہ ہوگا اس مرحلہ پر اگر میں اس غلط فہمی کا ازالہ کر دوں جس کو مخالفین ادارہ نے آغازِ کار سے لے کر اب تک مختلف رنگوں میں پھیلانے کی سعی بلیغ کی ہے کہ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کے ارکین وہی کچھ کہتے اور لکھتے ہیں جس کا اشارہ اوپر سے ہوتا ہے یعنی حکومت جو پالیسی بناتی ہے یہ لوگ اسی کا تتبع کرتے ہیں اور اسی کے لیے وجوہ جواز تلاش کرنا ان کے فرائض منصبی میں داخل ہے۔ حاشا و کلا! صورتِ حال یہ نہیں۔ میں ادارہ میں کم و بیش سولہ سترہ برس سے منسلک ہوں۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ اس طویل عرصے میں ایک بار بھی حکومت نے ہمارے کام، پالیسی، طریقِ کار یا مقاصد کی تعیین میں مداخلت کی ہو۔ میں پوری ذمہ داری سے کہہ سکتا ہوں کہ ہم میں سے جس رفیق نے بھی جو کچھ لکھا اس میں اس نے اپنے ہی خیالات اور ضمیر کی ترجمانی کی اور اس سلسلہ میں کسی نے بھی بجز اپنے ذوق و مسلمات کے کبھی کسی کی رہنمائی تسلیم نہیں کی۔ حکومت کی مداخلت تو بڑی بات ہے خود خلیفہ صاحب مرحوم کا یہ حال تھا کہ بحیثیت اکیڈمک ڈائرکٹر کے کبھی انھوں نے ہمیں مجبور نہیں کیا کہ ہم فکر و نظر کے کسی خاص نہج کی پیروی کریں، خاص نقطۂ نظر اپنائیں اور ان کی وضع کردہ ہدایات کے مطابق قلم کو جنبش دیں۔ بلکہ ذاتی طور پر خلیفہ صاحب بنیادی تصورات میں یگانگت کے بعد خیالات و اسلوب کی رنگا رنگی کو پسند کرتے تھے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان کے زمانہ میں کام کی نوعیت سادہ جمہوری اصولوں کی آئینہ دار تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اگر کسی مصنف کی صلاحیت کا پر اعتماد نہ کیا جائے، اسے ذہنی اور نفسیاتی لحاظ سے مطمئن نہ رکھا جائے تو وہ تحریر و نگارش میں اختراعاتِ فائقہ سے کام نہیں لے سکتا۔ ہمارا طریق کار یہ تھا کہ سال کے شروع ہی میں چند نشستوں میں باہمی مشورہ اور بحث و تمحیص کے بعد ہر ہر رکن اپنے اپنے ذوق کے مطابق موضوعِ تحقیق منتخب کر لیتا اور پھر بغیر کسی مداخلت کے کام جاری رکھتا۔

اول روز سے اپنے لیے ہم نے جن خطوطِ کار کو متعین کیا اس کی مختصر الفاظ میں وضاحت یہ ہے کہ خلیفہ صاحب نے تو یہ طے کیا کہ وہ اسلامی فکر و تصور کی تابش و ضو کی تعیین کریں گے اور موجودہ اصطلاحوں میں یہ بتائیں گے کہ اسلام جس اسلوبِ حیات کو پیش کرتا ہے اس کی خصوصیات کیا ہیں۔ ڈاکٹر رفیع الدین صاحب نے اسلام کے تعلیمی فلسفہ اور اس کے منشور و عومت کی وضاحت کو اپنے ذمہ لیا۔ صدیقی صاحب نے اسلام کے اجتماعی پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کا عہد کیا۔ خواجہ عبداللہ اختر نے ادبیاتِ فارسی اور ادیان و مللِ اسلامی کے موضوع کو اپنایا۔ مولانا شاہ جعفر صاحب ندوی نے اسلام کے ترقی پسندانہ رجحانات کی ترجمانی کا مورچہ سنبھالا۔ بشیر احمد صاحب ڈار اور میں نے جس عنوان کو اپنی تگ و دو کا محور قرار دیا وہ یہ تھا کہ مسلمانوں میں جو چوٹی کے حکما گذرے ہیں ان کے ان تصورات و نظریات کو اجاگر کیا جائے جن کی بدولت فکر و نظر کے دھاروں کو نئے موڑ عطا ہوئے ہیں۔ اسی طرح مولانا رئیس احمد صاحب جعفری کے بارہ میں طے ہوا کہ وہ اسلامی تاریخ اور اسلامی اقدار و اخلاق سے متعلق اظہار خیال کریں گے۔

ثقافت میں یوں تو ہم سب کچھ نہ کچھ لکھتے تھے مگر مستقلاً یہ ذمہ داری شاہد حسین صاحب رزاقی کے سپرد کی گئی کہ وہ مضامین کی فراہمی اور ترتیب میں خصوصیت سے دلچسپی لیں۔ رزاقی صاحب جامعہ عثمانیہ، حیدر آباد دکن میں تاریخ و سیاسیات کے استاد تھے۔ اسلامی ممالک کی سیاحت کے انھیں کئی مواقع ملے اور پاکستان کی تحریک میں پرجوش حصہ لینے کی وجہ سے ان کا حلقۂ تعارف بھی اچھا خاصہ وسیع تھا۔ اسلامی ممالک اور ان میں مروجہ رجحانات اور تحریکیں ان کا خاص موضوع ہیں اور وہ اپنی محنت، ذہانت اور شگفتہ تحریر و نگارش کی وجہ سے میاں صاحب مرحوم کے زمانہ ہی میں رفیق چن لیے گئے۔

خلیفہ صاحب کے ذہن میں ادارہ کے بارہ میں بہت بلند خیالات تھے۔ وہ اسے پاکستان کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سب سے بڑا علمی مرکز بنانے کے خواہاں تھے۔ ایسا مرکزی ادارہ جو پاکستان بھر کے دانش وروں کے لیے اظہارِ خیال کا ذریعہ بن سکے۔ مگر افسوس کہ قضا و قدر کی ستم ظریفیوں نے انھیں ان عزائم کی تکمیل کی مہلت ہی نہ دی اور وہ ۳۰ جنوری ۱۹۵۹ء کو اچانک حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے جنت کو سدھار ے۔

ان کے بعد ادارہ کی زمامِ ادارت میاں شریف صاحب نے سنبھالی۔ ان میں اور میاں صاحب مرحوم میں بجز مزاج و طبیعت کے اختلاف کے اور کوئی فرق نہ تھا۔ دونوں روشن خیال تھے۔ دونوں فلسفہ و حکمت کا گہرا اور مجتہدانہ ذوق رکھتے تھے اور دونوں ہی ترقی پسند اور عالمی شہرت کے حامل تھے اور لطف یہ ہے کہ ادارہ کی حکمتِ عملی، طریق کار اور اغراض و مقاصد میں بھی دونوں پوری طرح ہم آہنگ تھے، اس لیے میں ان کے عہد کو نیا عہد قرار نہیں دے سکتا۔ میرے نزدیک ان کے دور کو اسی دور کا تتمہ کہنا چاہیے۔ ان کا امتیازی کارنامہ یہ ضرور ہے کہ انھوں نے ادارہ کی عمارت میں توسیع کی، اس پر بالائی منزلیں تعمیر کیں اور رفقا کے لیے بعض ضروری آسائشیں مہیا کیں۔

ادارہ نے اس عرصہ میں عقائد، سیرت، اخلاق، سیاست، تصوف اور تعلیم و تمدن کے متعلق کم و بیش سوا سو کتابیں شائع کیں، جن میں ادارہ کے نقطۂ نظر کی جھلک نمایاں ہے۔ ان میں وہ کتابیں بھی شامل ہیں جو ادارہ سے باہر کے لوگوں نے لکھیں۔

ان میں مندرجہ ذیل کتابیں خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں:

(۱) اسلامک آئیڈیالوجی

امیر علی کی "اسپرٹ آف اسلام" کے بعد یہ دوسری کامیاب کتاب ہے جو انگریزی دان حضرات کے قلب و ذہن میں اسلام کے متعلق خوش گوار اور ایمان افروز تاثرات پیدا کر سکتی ہے۔ اس میں خلیفہ صاحب مرحوم نے موجودہ سائنسی اور علمی اصطلاحوں کی روشنی میں اسلامی اقدارِ حیات کی محکمی و استواری ثابت کی ہے۔ اشتراکیت کا تجزیہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ اس میں فکر و نظر کی کجی کہاں کہاں نمایاں ہے۔

(۲) میٹافزکس آف رومیؒ

رومی کو علامہ شبلی نے بھی ایک متکلم کی حیثیت سے پیش کیا اور اقبال نے بھی اس کی تعلیمات کو نئے علم الکلام کی اساس ٹھہرایا، لیکن جس شخص نے رومی کے مابعد الطبیعیاتی تصورات کو حقیقتاً نکھار کر پیش کیا وہ خلیفہ صاحب مرحوم کی ذات ہے۔ اس کتاب میں آپ نے وجود، صفات اور جبر و قدر وغیرہ کے بارہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں نہایت حکیمانہ اور دل نشین انداز میں روشنی ڈالی ہے۔

(۳) محمد دی ایجوکیٹر

یہ ایل گوئک کی تصنیف ہے۔ اس میں آں حضرتؐ کی زندگی پر اس نقطۂ نظر سے بحث کی گئی ہے کہ اس سے تہذیب وتمدن کے کون کون گوشے متاثر ہوئے۔

(۴) نیشنل انٹگریشن اینڈ اور ایسٹینز

میاں شریف صاحب مرحوم سابق اکیڈمک ڈائرکٹر ادارہ کے بعض مقالات کا بہت ہی قیمتی مجموعہ ہے۔ اس میں میاں صاحب نے ان مسائل واشکالات پر بحث کی ہے جن سے ملت اس وقت دوچار ہے اور بتایا ہے کہ ان مسائل واشکالات کا حل کیا ہے۔

(۵) فیلیسی آف مارکسزم

اس میں ڈاکٹر رفیع الدین نے 'مادیت تاریخ' کے مارکسی نظریہ کی پُرزور تردید کی ہے اور اس حقیقت کی پردہ کشائی کی ہے کہ قرآن نے تاریخ کے بارہ میں جو فلسفہ بیان کیا ہے وہ زیادہ قرین قیاس اور متوازن ہے۔

(۶) اسلام اینڈ تھیاکریسی

اس میں مولانا مظہر الدین صاحب صدیقی نے اس غلط فہمی کی تردید کی ہے کہ اسلامی ریاست کی تشکیل تھیاکریسی کے اصولوں ہی کے تحت ممکن ہے۔ اس میں انھوں نے اسلامی حکومت کے جمہوری خدوخال کو نمایاں کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے اور بتایا ہے کہ تھیاکریسی کا کوئی تصور اسلام میں موجود نہیں ہے۔

(۷) قرآن اور علم جدید

اس میں ڈاکٹر رفیع الدین صاحب نے بتایا ہے کہ علوم جدیدہ اور قرآنی تعلیمات میں رشتہ تعلق کی نوعیت کیا ہے۔

(۸) اسلام اور مذاہب عالم

مولانا مظہر الدین صدیقی نے اس میں اسلام کا دوسرے مذاہب سے تقابل کیا ہے اور اس بات کی وضاحت کی ہے کہ اسلام مذاہب کی آخری ارتقائی کڑی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۹) اسلام دینِ آسان

حضور اکرم کے فرمان کے مطابق دین آسان سی چیز ہے اور اس میں جن دشواریوں اور مشکلات کو خواہ مخواہ پیدا کر لیا گیا ہے اس کی ذمہ داری بر خود غلط علما اور فقہا پر عائد ہوتی ہے۔ اس کتاب میں اصول کی تشریح ہے۔ یہ مولانا جعفر شاہ صاحب کی تصنیف ہے۔

(۱۰) انتخابِ حدیث

احادیث کا بہترین انتخاب۔ اس میں مولانا جعفر شاہ صاحب پھلواروی نے اُن تمام احادیث کو نہایت سلیقے سے یک جا کر دیا ہے جو اخلاق، سیرت اور احکام و مسائل دینی کی وضاحت کرتی ہیں۔

(۱۱) سیاستِ شرعیہ

مولانا رئیس احمد جعفری کی کتاب جس میں قرآن، احادیث، روایات و آثار کی روشنی میں اسلامی دستور کی روح اور تفصیلات کی تعیین کی گئی ہے۔

(۱۲) مسلمانوں کے سیاسی افکار

پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی نے اس میں اسلامی سیاسیات پر مسلمان مفکرین کے نظریات کی مکمل تاریخ درج کی ہے۔

(۱۳) تاریخِ جمہوریت

اس میں جناب شاہد حسین صاحب رزاقی نے قبائلی معاشرے سے لے کر دورِ حاضرہ تک جمہوریت کی مکمل تشریح کی ہے۔

(۱۴) مسئلۂ زمین

پروفیسر محمود احمد صاحب کی مسئلۂ زمین پر اردو میں پہلی کتاب۔

(۱۵) تاریخِ تصوّف

بشیر احمد صاحب ڈار کی اس کتاب میں اسلام سے قبل کے متصوفانہ افکار کی تشریح مذکور ہے۔

(۱۶) بیدل

خواجہ عباد اللہ اختر کی اس کتاب میں مرزا عبد القادر بیدل کے مقامِ شعری کی تعیین کی گئی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۱۷) طب العرب

جناب حکیم نیر واسطی نے ایڈورڈ جی براؤن کی کتاب "اریبین میڈیسن" کا کامیاب ترجمہ کیا ہے اور اس پر مفید تعلیقات رقم فرمائی ہیں۔

(۱۸) عقلیات ابن تیمیہ

اس میں میں نے منطق، فلسفہ اور علم کلام کے بارہ میں علامہ کی فکری کاوشوں کی تشریح کی ہے اور بتایا ہے کہ جدید حکما کے مقابلہ میں ان کی آرا کا کیا مقام ہے۔

ادارے کے دوسرے دَور یا نئے دَور کا آغاز یکم جولائی ۱۹۷۶ء سے ہوتا ہے جب کہ میاں صاحب مرحوم کے بعد ڈاکٹر شیخ محمد اکرام صاحب نے عنانِ اہتمام اپنے ہاتھ میں لی۔ شیخ صاحب خود بھی ایک کامیاب مصنف ہیں۔ ان کے نتائج فکر اردو اور انگریزی دونوں میں شائع ہو کر مقبولیت و پذیرائی کا خلعت پا چکے ہیں۔ اسلامی ہندوستان کی دینی تاریخ ان کا متعین موضوع ہے جس پر برسوں انھوں نے دادِ تحقیق دی ہے اور جہاں تک صوفیا اور ان کی اخلاقی و اجتماعی اثر آفرینیوں کا تعلق ہے ان کے بارہ میں تو ان کو تخصص کا درجہ حاصل ہے۔

انھوں نے ادارہ کی باگ ڈور ہاتھ میں لیتے ہی رفقا کو جا بجا پرکھا، ان کے ذوق اور صلاحیتِ کار کا اندازہ کیا اور یہ طے کیا کہ سردست تین گوشوں کو خصوصی التفات کا سزاوار قرار دیا جائے۔

(۱) ثقافت کو جو اب 'المعارف' کی شکل اختیار کر چکا ہے ناظرین کے سامنے ایک معیاری علمی و دینی پرچہ کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔

(۲) خلیفہ صاحب مرحوم اور میاں صاحب مرحوم یوں کہ بنیادی طور پر فلسفی تھے اور فلسفہ و معقولات سے زیادہ شغف رکھتے تھے اس لیے لائبریری میں بھی تقریباً ساری کتابیں عقلیات ہی پر مشتمل تھیں۔ شیخ صاحب کا ارادہ ہے کہ اس میں تاریخ، تصوف اور دینیات کے بارہ میں ان تمام عربی و فارسی مآخذ کا اضافہ کیا جائے جن سے استفادہ کیے بغیر تحقیقی کام کرنا ناممکن ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں انھوں نے پہلا قدم یہ اٹھایا ہے کہ ازراہ کرم اپنی لائبریری کا معتدبہ حصہ عاریتہً ادارہ کی تحویل میں دے دیا ہے۔

(۳) تصنیف و تالیف کے بارہ میں شیخ صاحب کی پالیسی بعینہٖ وہی ہے جس کو اول روز سے ادارہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نے محفوظ رکھا۔ البتہ وہ اس میں اتنی تبدیلی ضرور چاہتے ہیں کہ آئندہ کمیت و تعداد سے زیادہ اہمیت نوعیت و کیفیت کو دی جائے اور کوشش کی جائے کہ جو کتابیں بھی یہاں سے شائع ہوں موضوع، مواد ترتیب اور سج دھج کے اعتبار سے ایسی ہوں کہ پڑھے لکھے طبقہ کو اپنی طرف متوجہ کر سکیں اور نہ صرف ان کے لیے ذہنی تغذیہ کا سامان فراہم کریں بلکہ تنویرِ فکر کا اہتمام بھی کر سکیں۔

جہاں تک تحریر و نگارش میں مقصدیت، اور نصب العین کی رعایت کا تعلق ہے ایک نزاعی مسئلہ دراصل یہ اٹھ کھڑا ہوا ہے کہ پاکستان میں ہمیں کس نوع کے لٹریچر کی ضرورت ہے۔ کیا ایسی تصنیفات کی جو مستشرقانہ اسلوب تحقیق کی حامل ہوں؟ یا ان تخلیقات کی جن میں اجتہاد، اپج اور فکر کی تازہ کاریاں نمایاں ہوں۔ یہ دونوں انداز ایسے ہیں جو اپنے دامن میں خوبیاں اور نقائص لیے ہوئے ہیں اس لیے کسی ایک کو اپنانا مشکل ہی نہیں مضر بھی ہے۔ مثلاً اول الذکر انداز میں خوبی یہ ہے کہ اس میں مواد کی فراہمی پر زیادہ زور دیا جاتا ہے سنین و واقعات کی جزئیات کو زیادہ حزم و احتیاط سے ضبطِ تحریر میں لایا جاتا ہے اور کوشش کی جاتی ہے کہ سوانح یا نظریات کی وضاحت و تشریح کا کوئی گوشہ تشنۂ تحقیق نہ رہنے پائے۔

ظاہر ہے کہ غور و فکر کے اس نہج کو اپنانے سے کتاب کی افادیت کہیں بڑھ جاتی ہے۔ لیکن اسلوبِ تحقیق میں بنیادی نقص یہ ہے کہ اس سے فکر و اجتہاد کی صلاحیتیں مفلوج ہو جاتی ہیں اور کتاب ٹھس، بے جان اور بے کیف ہو کر رہ جاتی ہے۔ مزید برآں یہ ذوقِ استشراق مصنف کو ماضی کی غیر ضروری جزئیات میں اس طرح الجھا دیتا ہے کہ اس کا رشتہ حال و استقبال کے نئے تقاضوں سے بالکل منقطع ہو جاتا ہے۔

ثانی الذکر طریقِ نگارش کا حامی ماضی کے مقابلہ میں حال و استقبال کے داعیات کو زیادہ درخورِ اعتنا سمجھتا ہے اور تحقیق پر اختراع و تخلیق کو بہر حال ترجیح دیتا ہے۔ اس کا یہ نظریہ ہے کہ بسا اوقات ایک جملہ اور ایک فقرہ یا پیراگراف ایسا ہو سکتا ہے کہ اس کے آگے بھاری بھرکم کتاب بھی ہیچ نظر آئے یعنی معانی کے اعتبار سے وہ ایسا چشم کشا اور بصیرت افروز ثابت ہو سکتا ہے کہ جس کی تابانیوں سے حال و مستقبل کی تاریکیاں چھٹ جائیں اور نظر و بصر کے سامنے زندگی کے نئے افق ابھرنے لگیں۔ یہ حسن ظن بجا مگر اس میں قباحت کا یہ عظیم پہلو پنہاں ہے کہ ماضی کا گہرا مطالعہ کیے بغیر، اور اپنے تہذیبی و تمدنی ورثہ کا تحقیقی جائزہ لیے بنا، جو کچھ بھی لکھا جائے گا اس میں بلا کی سطحیت اور اتھلا پن پایا جائے گا اس لیے افراط و تفریط سے ہٹ کر بین بین اور متوازن راستہ یہی ہے کہ تحقیق و تفحص میں فراہمیِ مواد اور ترتیب و تدوین کا معیار تو وہ رکھا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جائے جس کی نمائندگی مستشرقین کا گروہ کرتا ہے اور اسلوب ایسا تحقیقی و تنقیدی اختیار کیا جائے جس میں حال و مستقبل کی تعمیر کے سلسلے میں موثر مدد مل سکے۔

خوشی کی بات یہ ہے کہ شیخ صاحب تصنیف و تالیف کے بارہ میں ایسی متوازن حکمتِ عملی کو اپنانے کے حامی ہیں۔ وہ نہ اتنے ماضی پسند ہیں کہ حال کے تقاضوں سے دامن کشاں رہیں اور نہ اس درجہ ترقی پسند ہیں کہ ماضی اور تاریخ سے بالکل ہی بے گانگی اختیار کرلیں۔ اگر اللہ تعالیٰ نے انھیں خدمت کا موقع دیا تو ہمیں امید ہے کہ ادارہ ان شاء اللہ ان کی رہنمائی اور قیادت میں نہ صرف ترقی ہی کرے گا بلکہ اس کردار کو بھی ادا کرکے رہے گا موجودہ تاریخ جس کی متقاضی ہے۔

عقلیاتِ ابنِ تیمیہ

از مولانا محمد حنیف ندوی

علامہ ابن تیمیہ کی جامعیت کے دائرے بہت وسیع ہیں۔ غزالی کے بعد یہ دوسرے شخص ہیں جنھوں نے اسلام کے نظامِ حیات کا اس دقتِ نظر سے جائزہ لیا ہے اور بتایا ہے کہ تفسیر، حدیث، تصوف اور فقہ و اصول کی تشریح میں ہمیں کن پیمانوں سے کام لینا چاہیے یا علم الکلام یا عقائد میں وہ کون کون موڑ ہیں جہاں ہمارے ہاں فکر و بصر کے قافلوں نے یونانی تہذیب و ثقافت کی بچھی ہوئی راہوں سے ہٹ کر اپنے لیے جداگانہ اور منفرد راستہ اختیار کیا ہے۔——— علامہ کی پوری زندگی الحاد و زندقہ کے خلاف جہاد میں بسر ہوئی ہے۔ چناں چہ انھوں نے جس کامیابی و منر مندی کے ساتھ کتاب و سنت کے رخِ زیبا کو نکھارا ہے، بدعات کی پُرزور تردید کی ہے اور اسلام کے چہرۂ روشن سے یونانیت اور عجمیت کے دبیز نقابوں کو ہٹایا ہے یہ انھی کا حصہ ہے۔ بلاشبہ یہ اپنے دور کے عظیم مجدد و مصلح تھے۔ ہمارے نزدیک ان کا سب سے بڑا کارنامہ یا شہ کار یہ ہے کہ انھوں نے اپنے زمانہ کے "عقلیات" کو بہ کمال ژرف نگاہی کھنگالا ہے اور تنقید و احتساب کے بعد ثابت کیا ہے کہ ان کے مقابلہ میں اسلام کا موقف کہیں زیادہ صحیح، استوار اور متوازن ہے۔ اس کتاب کا موضوع ان کی یہی گراں قدر تنقیدات ہیں جو کسی طرح بھی بیکن اور لائبنیز کی تنقیدات سے کم چٹکیلی اور کم تیز نہیں۔ صفحات ۲۲۳۔ قیمت سفید کاغذ ۹ روپے۔ سستا ایڈیشن ۶ روپے

ملنے کا پتہ: سیکریٹری ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور

© rasailojaraid.com